پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری

فکرِ اقبال کا ماخذ..... قرآنِ کریم

فکرِ اقبال کے ماخذ، ماہرینِ اقبالیات کا ہمیشہ موضوع رہے ہیں۔ ایک طرف اقبال نے اپنی نیک سیرت والدہ، صوفی منش والد اور راست فکر استاد مولوی سید میر حسن سے خوب خوب استفادہ کیا تو دوسری جانب یونانی فلسفہ، عہد جدید کا فکر، واقعاتِ عالم اور خاص طور پر تاریخ اسلام، اقبال کے ماخذ ہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو فکرِ اقبال کے نمایاں ترین ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔

حضرت علاّمہ اقبال نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں بھرپور شاعری کی۔ غزل اور خاص طور پر پابند نظم کی متعدد اصناف کو اوجِ کمال تک پہنچایا۔ حضرت علاّمہ کی مختصر زندگی میں شاعری کا زمانہ تقریباً چالیس برسوں پر محیط ہے، جسے ناقدین ان کے فکر و فن کو سمجھنے کے لیے مختلف ادوار میں بانٹتے ہیں۔

علامہ نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی، جو زیادہ تر روایتی اور غزل کے کلاسیکی انداز سے عبارت ہے، تاہم یہ آغاز بھی بڑے بڑے شعرا کے عروج کی شاعری سے کہیں بہتر دِکھائی دیتا ہے۔ یہی ایک بڑے شاعر کا وصف ہے کہ آغاز ہی میں فن اور مہارت کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ حضرت علاّمہ نے جلد ہی غزل سے نظم کی طرف سفر کیا اور 'ہمالہ' جیسی نظم لکھی۔ قومی اور ملّی شعور حضرت اقبال کے یہاں شروع ہی سے دِکھائی دیتا تھا۔ شاندار ماضی کے زوال کا غم، مسلمانوں کی زبوں حالی، ابنائے وطن کو لگی ادبار اور جہالت کی بیماری اور نوآبادکاروں (colonial powers) کی دنیا میں من مانی نے اقبال کو جھنجوڑ کے رکھ دیا۔

اسلامی تاریخ، مسلمانوں کے علمی ورثے، اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی، مسلمانوں کی فکری تحریکوں،

مغربی تہذیب کے socio-cultural dynamics اور مغرب کے فلسفے کے عمیق مطالعے نے حضرت علامہ کو قرآنِ کریم کی دہلیز پر لا کھڑا کیا۔

کسی کتاب یا مصنف سے شعوری طور پر متاثر ہونا ایک بات ہے اور اسے تحت الشعور کے اندر جذب کرنا دوسری بات۔ تحت الشعور کی سطح پر کسی کتاب یا انسان کا اثر جب جزوِ شخصیت بن جاتا ہے تو یہ اثر قبول کرنے والے کے اندازِ فکر و نظر کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے تو اسی زاویۂ نگاہ سے اور دیکھتا ہے تو اسی عینک سے۔ اس کے سانچے اور پیمانے اور حسن و قبح اور خوب و ناخوب کے معیار بھی اسی منبعِ فیضان سے برآمد ہوتے ہیں اور اگر وہ شاعر اور ادیب ہے تو اس کا نظریۂ شعر، اس کی لفظیات، اس کا اسلوب، اس کی علامتیں اور اس کے استعارے بھی اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ قرآن کے ساتھ اقبال کا تعلق اسی نوع کا ہے۔[1]

ہماری تاریخ میں قرآنی مطالب کو السنۂ شرقیہ میں نثر اور نظم دونوں صورتوں میں پیش کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ مولانا روم کی مثنویِ معنوی کو 'قرآن در زبانِ پہلوی' کہا گیا۔ ہر چند قرآنِ کریم کے باقاعدہ ترجمے کا کام اسلامی تاریخ کے پہلے ساڑھے گیارہ سو سال تک نہیں ہوا اور اوّلین تراجم میں سورۃ یوسف کا پنجابی زبان میں ترجمہ اور سورۃ یوسف ہی کی منظوم پنجابی تفسیر حافظ برخوردار رانجھا (متوفی ۱۷۵۸ء) نے کی[2]، اور پہلا فارسی ترجمہ، کیونکہ اُس وقت برِصغیر میں فارسی ہی علمی زبان تھی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۷۶۲ء) نے کیا۔ بہت سے صلحاء اور دردمند مسلمانوں نے چیدہ چیدہ آیاتِ قرآنی کے منظوم اردو تراجم کیے، جنھیں تداول بھی نصیب ہوا۔ اس ضمن میں بہت شاندار، مگر مختصر تذکرہ محترم بریگیڈیر حامد سعید اختر نے اپنے بیش قیمت مضمون 'قرآن اور اقبال' میں پیش کیا ہے، جو اقبال اکادمی پاکستان کے مجلّے اقبالیات کے شمارے جنوری۔ مارچ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔[3] قرآنی آیات، مثلاً: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُ وْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (سورۃ رعد:۱۱) ترجمہ: اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا، جب تک وہ اپنی حالت خود نہ بدلے اور قرآنی آیت: یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ (سورہ توبہ:۳۲) ترجمہ: یہ (کفار) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مشہور اشعار کی صورت میں ہماری زبان پر ہیں۔

حضرت علامہ نے قرآنی متن کا براہِ راست منظوم یا منثور ترجمہ نہیں کیا، شاید اس لیے کہ حضرت علامہ اقبال کے نزدیک قرآن محض ایک کتاب نہیں، بلکہ الکتاب ہے۔ اقبال کائنات میں موجود حکمت و دانائی، نظم و ضبط، ہم آہنگی اور حسن و جمال کو 'سرودِ ازلی' سے تعبیر کرتے ہیں۔[۴] آپ کے یہاں پوری کی پوری کائنات قرآنِ تکوینی اور مجلد کی صورت میں (مابین الدفتین) کتاب اللہ، کتابِ تدوینی ہے:

آں کتابِ زندہ ، قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لایزال است و قدیم (کلیات فارسی، ۱۲۱)

صد جہاں تازہ در آیاتِ اوست
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست (کلیات فارسی، ۶۵۴)

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود (کلیات فارسی، ۶۶۹)

قرآنِ کریم وہ زندہ و جاوید کتاب ہے، جس کی حکمت و دانش قدیم بھی ہے اور دائمی و لازوال بھی۔ اس کی آیاتِ کریمہ میں سینکڑوں نئی دنیاؤں کے بے انتہا امکانات پوشیدہ ہیں اور اس کے آنات و لمحات میں اَن گنت صدیاں اور لاتعداد زمانے بند ہیں۔ جب یہ کتاب قلب و جان پر اُترتی ہے تو انھیں زیر و زبر کر کے رکھ دیتی ہے اور جب یہ انقلاب آتا ہے تو آدمی کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔

کلامِ اقبال کے عمیق مطالعے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اقبال نے قرآنِ تکوینی پر غور و خوض کے ساتھ ساتھ قرآنِ تدوینی کو اپنے تفکر کا جزوِ لاینفک بنا لیا تھا۔ بقول غلام رسول ملک: ان کا فکر قرآنی فکر ہے اور ان کی نظر قرآنی نظر ہے اور جب وہ اپنے نتائجِ فکر و نظر کو الفاظ کا جامہ پہنا لیتے ہیں تو غیر ارادی طور پر قرآنی اسلوب و آہنگ کی شان نمودار ہوتی ہے۔[۵]

کیا تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ میں بھی حضرت علامہ کا فکری ماخذ قرآنِ کریم ہی ہے، جس کی بنیاد پر حضرت علامہ فلسفۂ دین کی تشکیل نو یا بالفاظِ دیگر ایک نئے علم الکلام کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے؟

تشکیلِ جدید کا بنیادی ماخذ تو قرآنِ کریم ہی ہے اور وہ علوم وفنون بھی، جو اس کتابِ حکیم کے مندرجات کی تفہیم کے لیے عصری تقاضوں کے پیشِ نظر از خود منصۂ شہود پر آ گئے۔ یہ درست ہے کہ خطبات میں حضرتِ علامہ کے مخاطب بالعموم مغربی فکر سے متاثر لوگ تھے اور موضوعات کے تنوّع کے باعث اور مخاطب لوگوں کی رعایت سے حضرتِ علامہ کو نسبتاً مشکل اندازِ بیان اختیار کرنا پڑا۔ حضرتِ علامہ کی آراء اور خطبات کے مندرجات کے بارے میں بے شمار تبصرے کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں محترم ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب خطباتِ اقبال: تسہیل و تفہیم میں برِصغیر کے گذشتہ صدی کے بے شمار مشاہیر کی آراء اور اعتراضات بلا کم و کاست بڑی فراخ دلی کے ساتھ نقل کر دیئے ہیں۔ ان میں سے متعدد تنقیدات تو ایسی بھی ہیں، جو درحقیقت درخورِ اعتنا بھی نہیں تھیں، مگر ڈاکٹر جاوید اقبال نے ان کو اپنی بلند حوصلگی کے سبب درج کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں دَورِ حاضر کے جید عالم سید حسین نصر اور متعدد مستشرقین کی نکتہ چینی کو بھی من وعن بیان کر دیا ہے۔[۶]

مَیں ان اعتراضات میں سے صرف دو ایک کا تذکرہ کر کے دوبارہ اپنے موضوع پر آؤں گا۔ مَیں نے اپنے استادِ مکرم ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم کو ہمیشہ ہی حضرت اقبال کے ایک دیوانے اور بہت بڑے مداح کے طور پر دیکھا، تاہم اس بات پر وہ ہمیشہ ہی چیں بجبیں رہے کہ حضرت علامہ Intuition اور Revelation میں کوئی qualitative difference نہیں دیکھتے تھے اور ان میں محض quantitative difference کا پایا جانا خیال کرتے تھے۔ گویا وحی اور وجدان میں کیفیت کا اختلاف نہیں ہے، صرف کمیت کا اختلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح استادِ محترم فرماتے تھے، اُس طرح حضرت علامہ نے کہیں نہیں لکھا۔ ہاں، البتہ حضرت علامہ اپنے religious experience کے نتائج کو ذریعہ علم کا درجہ ضرور دیتے ہیں۔ مَیں اپنی کم مائیگی کے سبب استادِ محترم کو کبھی باور نہ کرا سکا کہ ہر مظہر (phenomenon) کی کئی ایک dimensions ہو سکتی ہیں۔ اقبال کی رائے میں مذہبی تجربہ (Religious Experience) ایک نبی کے یہاں اور ایک صوفی کے یہاں وقوع

پذیر تو ہوسکتا ہے، مگر دونوں کے تجربات Identical نہیں ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب کو پیش آمدہ التباس کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر فاروقی کی نگاہ میں اقبال کے خیالات میں الجھاؤ کا سبب پیغمبرانہ وحی کو صوفیانہ واردات اور شاعرانہ القاء پر قیاس کرنے سے پیدا ہوا، لیکن ان کا اعتراض درست نہیں۔ اقبال وحی، کشف اور القاء کو ان معنوں میں مذہبی تجربہ قرار دیتے ہیں کہ اس علم سے انسان کی حقیقت مطلقہ تک رسائی ممکن ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ درجات کے اعتبار سے اقبال پیغمبر، ولی اور شاعر کو ایک ہی سطح پر کھڑا دیکھتے ہیں، قطعی غلط ہے۔ ۷

دوسرا اعتراض، جو الطاف احمد اعظمی نے پانچویں خطبے 'اسلامی ثقافت کی رُوح' (The Spirit of Muslim Culture) پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا۔ حضرت علامہ نے واقعہ معراج پر شاہ جہاں کے زمانے کے مشہور صوفی حضرت عبدالقدوس گنگوہی کا یہ ارشاد نقل کیا تھا: ۸

> Muhammad of Arabia ascended the highest Heaven and returned. I swear by God that if I had reached that point, I should never have returned.(9)

> ترجمہ: محمد عربیؐ آسمان کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ گئے اور واپس آ گئے۔ خدا کی قسم! اگر مَیں اُس بلندی تک گیا ہوتا تو کبھی زمین پر واپس نہیں آتا۔ ۱۰

اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے الطاف احمد اعظمی حضرت علامہ کے ماحصل کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ایک پیغمبر اور صوفی کے شعوری تجربے میں نفسیاتی اعتبار سے جو فرق ہے، وہ عبدالقدوس گنگوہی کے مذکورہ الفاظ سے بالکل واضح ہے۔ صوفی روحانی تجربے کی جن بلندیوں تک پہنچتا ہے اور وہاں فراغِ خاطر کی جس نعمت سے بہرہ اندوز ہوتا ہے، اُس حالت اور مقام سے وہ کبھی جدا ہونا پسند نہیں کرتا..... اس کے برخلاف پیغمبر روحانی تجربے کی انتہائی بلندیوں تک جانے کے باوجود واپس آتا ہے اور اس کی یہ واپسی تمام تر تخلیقی نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس کا پیغام انقلاب انگیز ہوتا ہے، وہ تاریخ کا رُخ بدلتا ہے اور دنیا کو نئے تصورات سے آشنا کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے روحانی تجربے کو ایک زندہ اور متحرک عالم گیر قوت میں تبدیل کرے..... الطاف احمد اعظمی مزید لکھتے

ہیں کہ اس تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک روحانی اعتبار سے نبی اور ولی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ فرق جو ہے، وہ نفسیاتی اعتبار سے ہے، یعنی ولی کا روحانی تجربہ انفرادی نوعیت کا ہے، جب کہ نبی کا روحانی تجربہ غیر انفرادی اور عالم گیر ہوتا ہے۔[11]

اعظمی صاحب کے اعتراض ہی میں خود جواب بھی شامل ہے۔ حضرت علامہ ایک نبی اور صوفی کے بنیادی وظیفے کے فرق کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک صوفی کے لیے حقیقتِ مطلقہ سے اتحاد اور ملن اس کے لیے آخری منزل ہے، مگر انبیا اپنے روحانی تجربے کو عالم گیر قوت کی شکل عطا کر کے اسے social phenomena بناتے ہیں۔ نبی اس منزل سے واپسی پر عامۃ الناس کے ساتھ محلوں اور آبادیوں میں رہتا ہے اور اپنے آپ کو ایک ماڈل کے طور پر پیش کرتا ہے اور پھر اپنے conduct اور طریقۂ حیات کے بارے میں لوگوں سے فقد لبثت فیکم عمرا (سورۃ یونس:۱۶) کہہ کر تصدیق طلب کرتا ہے کہ میری تعلیمات قابلِ عمل ہیں، گویا نبی کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ وہ جو نظریہ پیش کرتا ہے، خود اسے demonstrate کر کے دِکھاتا ہے۔ اسی لیے اقبال اسلام کی آمد کو Inductive Intellect کا ظہور قرار دیتے ہیں۔

الطاف احمد اعظمی، اقبال پر ایک اَور اعتراض یہ کرتے ہیں کہ عربی میں ان کی استعداد ناکافی تھی۔ یہ اعتراض اس لیے بھی غلط ہے کہ یورپ جانے سے قبل اقبال چار سال تک پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ یورپی یونیورسٹیوں میں مستشرقین کے ساتھ عربی زبان کے استاد رہے۔ پوسٹ گریجویٹ سطح پر عربی زبان وادب کے معلم کو عربی زبان سے نابلد قرار دینا 'اعتراض برائے اعتراض' کے سوا اَور کیا ہوسکتا ہے۔

حضرت علاّمہ کے بارے میں ایک بہت بڑی شخصیت کا comment، جو میرے لیے ہمیشہ ہی حیرت کا باعث رہا، وہ حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بیان ہے، جو سب سے پہلے جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی کے مجلّہ جوہر کے شمارہ مئی جون ۱۹۳۸ء کو حضرتِ علامہ کی وفات کے فوراً بعد چھپا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں ہفت روزہ ایشیا میں چھپا تھا اور اسی پرچے کے نومبر ۲۰۱۲ء کے ایک شمارے میں دوبارہ سامنے آیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

اقبال کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے، عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا۔ اس بدگمانی کے پیدا کرنے میں خود ان کی افتادِ طبع کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ ان میں کچھ فرقہ ملامتیہ کے میلانات تھے، جن کی بنا پر اپنی رِندی کے اشتہار دینے میں انھیں کچھ مزہ آتا تھا، ورنہ درحقیقت وہ اتنے بےعمل نہ تھے۔ قرآنِ مجید کی تلاوت سے ان کو خاص شغف تھا اور صبح کے وقت بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، مگر آخیر زمانے میں طبیعت کی رِقت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ تلاوت کے دَوران روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور مسلسل پڑھ ہی نہ سکتے تھے۔ نماز بھی بڑے خشوع وخضوع سے پڑھتے تھے، مگر چھپ کر۔ ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ مَیں نِرا گفتار کا غازی ہوں۔[۱۲]

پھر مولانا، اقبال کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

اقبال بڑا اُپدیشک ہے ، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا ، کردار کا غازی بن نہ سکا (کلیات اردو، ۳۲۴)

حیران کن بات ہے کہ وہ فلسفی شاعر، جسے ہمیشہ ہی vitalist اور قوت پرست کہا گیا ہے، جو اُمت مسلمہ کی عروقِ مردہ میں زندگی کے خون کی روانی اور عظمتِ رفتہ کی بازیافت کے لیے تڑپتا رہا، مولانا نے اس میں ملامتیہ میلانات کیسے ڈھونڈ لیے۔ میری رائے میں مولانا کو اقبال کی کسرِ نفسی اور فروتنی کے اظہار سے شاید یہ مغالطہ ہوا ہے اور مولانا نے یہاں poetic stair کے احتمال کو بھی نظر انداز فرما دیا۔

قرآنِ کریم سے اقبال کے شغف کی جڑیں تلاش کرنا ہوں تو ان کی زندگی کا ہر لمحہ گواہ ہے کہ وہ ہمیشہ قرآن ہی کے جلو میں چلے۔ انھوں نے بہت بچپن ہی میں محسوس کر لیا کہ گویا قرآن ان کے اپنے قلب پر اتر رہا ہے اور جب اقبال کے قلب پر قرآن باقاعدہ نازل ہونے لگا تو وہ کہہ اُٹھے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی ، نہ صاحبِ کشاف (کلیات اردو، ۴۰۲)

جب اقبال نے فکری زندگی میں بلوغت حاصل کی اور انھیں احساس ہوا کہ اب وہ زندگی کے اسرار کو سمجھنے

کے، کسی حد تک، اہل ہیں تو خود ان کا دل بول اٹھا کہ وہ دانش، جو قرآن کے سراجِ منیر سے فیض حاصل نہیں کرتی، ناقص ہے اور اس لیے ناقص ہے کہ وہ دانش محدود ذہن اور فانی فکر رکھنے والے فانی وجود کی سوچ ہے۔ اولادِ آدم کی ہم جہتی اور فلاح فقط قرآنی ہدایت ہی کی مدد سے ممکن ہے۔[۱۳] اسی کامل یقین کی بِنا پر ۱۹۱۵ء میں مثنوی اسرارِ خودی میں بحضور رسالت مآبؐ التجا پیش کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ مَیں جو کچھ لکھ رہا ہوں اور امتِ محمدیہ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، وہ قرآن کی روشنی میں پیش کر رہا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ اپنے لیے رسول اللہؐ کے حضور خود تجویز کرتے ہیں:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم
اہلِ ملت را نگہدار از شرم
روزِ محشر خوار و رُسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا (کلیات فارسی، ۱۶۸)

ترجمہ: اگر میرا دل جوہرِ آبدار نہیں اور میرے اشعار میں قرآن کے علاوہ کچھ اَور تحریر ہے تو اے اللہ کے رسولؐ! آپ میرے فکر کے شرف کا پردہ چاک کر دیجیے اور اس خیابان (دنیا) کو میرے کانٹے سے پاک کر دیجیے۔ میرے افکار کی حرمت ختم کر دیجیے اور اس گلشن کو میرے وجود کے کانٹے سے پاک کر دیجیے۔ لباسِ زندگی کو مجھ پر تنگ کر دیجئے اور ملت کو میری شاعری کے شر سے محفوظ رکھیے۔ مجھے قیامت کے روز خوار و رُسوا کیجئے اور اپنی پابوسی سے

محروم رکھیے۔

مظفر حسین لکھتے ہیں کہ اس زوردار اور واشگاف اعلان کے بعد یہ بات محتاجِ بیان نہیں رہتی کہ علامہ اقبال کے کلام اور فلسفے کو سمجھنے کے لیے قرآن سے رجوع کس قدر ضروری ہے۔ چونکہ قرآن ہی علاّمہ اقبال کے افکار و نظریات کا اصل جوہر ہے، اس لیے فکرِ اقبال کے فہم کی بنیادی شرط ہی یہ ہے کہ ان کے خیالات و افکار کے اصل سرچشمے، یعنی قرآن کی طرف رجوع کیا جائے۔.....ہمیں علاّمہ اقبال کی فکر کو قرآن اور اسلامی روایات ہی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس سے ہٹ کر جو کوشش بھی ہوگی، وہ ہمیں کسی اَور ہی سمت میں لے جائے گی، جو علاّمہ اقبال کا مقصود نہیں۔[۱۴]

۱۹۲۷ء میں اقبال نے زبورِ عجم میں بھی اپنی اس روش کا اعادہ کیا۔ فرماتے ہیں:

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست
بہ جبریلِ امیں ہم داستانم
رقیب و قاصد و درباں ندانم (کلیاتِ فارسی، ۵۳۸)

ترجمہ: یہ نہ سمجھ کہ مَیں بغیر شراب کے مست ہوں اور شاعروں کی مانند محض افسانہ گوئی کر رہا ہوں۔ مَیں تو جبریلِ امیں کا ہم داستاں ہوں۔ میرا کوئی رقیب، قاصد یا دربان نہیں بلکہ مَیں اللہ تعالیٰ سے براہِ راست فیض یاب ہوں۔

ظاہر ہے، وہ داستان، جو حضرت جبریل نے سنائی تھی، وہ قرآنِ کریم تھا۔

اقبال کے بیشتر اشعار ایسے ہیں، جن میں بلاواسطہ طور پر، کسی آیتِ قرآنی یا حدیثِ نبوی کی طرف اشارہ ہے اور شاید ہی کوئی شعر یا نظم ایسی ہو، جس میں بالواسطہ طور پر قرآن، سنت یا تاریخِ اسلام کا تذکرہ نہ ہو۔

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ
عشق را ناموس و نام و ننگ دہ (کلیاتِ فارسی،۶۲)

ترجمہ: اپنے دل کو اللہ کے رنگ میں رنگ لے اور عمل سے اپنے عشق کی عزت و وقار میں اضافہ کر لے۔

یہ قلب وضمیر کو اللہ کے رنگ میں رنگنا صِبۡغَةَ اللّٰهِ وَ مَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً (سورۃ بقرہ: ۱۳۸) ترجمہ: رنگ اللہ کا چاہیے، اس سے زیادہ حسین وجمیل رنگ اَور کیا ہوسکتا ہے) اور یہ اللہ کے نور سے دیکھنا کہ جس کے بارے میں نبی اکرمؐ نے ابنِ کثیر کے روایت کردہ ایک حدیث کے مطابق ارشاد فرمایا: مومن کی فراست سے ڈرو، اس لیے کہ وہ اللہ کے نُور سے دیکھتا ہے۔۱۵

ایک مجلس میں ایف سی کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے اقبال سے پوچھا کہ تم جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ قرآن لفظ و معانی کے ساتھ محمدؐ پر نازل ہوتا تھا؟ اقبال نے جواب دیا کہ یہ یقین کی بات نہیں ہے، بلکہ یہ میرا تجربہ ہے۔ مجھ پر پورا شعر اترتا ہے تو پیغمبر پر پوری عبارت کیوں نہیں اتری ہوگی۔۱۶

قرآنِ کریم سے استفادے کی صورتیں

کلامِ اقبال میں قرآن سے استفادے کی تین صورتیں ہیں۔ اوّل: قرآنی آیات یا ان کے اجزا کو نظم کرنا، دوم: قرآنی مفاہیم کا براہِ راست استعمال اور سوم: قرآنی مفاہیم سے اخذ و اکتساب۔

سب سے پہلے اقبال کے کلام میں قرآنی آیات یا ان کے اجزا کو دیکھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں اردو اور فارسی کلام سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

'جوابِ شکوہ' کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے، جس میں قوتِ عشق سے دنیا کو زیر و زبر کرنے اور زمانے میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کرنے کا پیغام دیتے ہوئے اقبال سورۃ انشراح کی چوتھی آیت کے ذریعے اپنے خیال کو یوں منوّر کرتے ہیں:

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے (کلیاتِ اقبال اردو، ۲۳۶)

ضربِ کلیم کی ایک نظم 'لاہور و کراچی' میں مسلمانوں کو اللہ پہ نظر رکھنے اور غیر اللہ سے منہ موڑنے کا درس دیتے ہوئے اقبال نے سورۃ قصص کی آیت ۸۸ کا ایک حصہ نظم کیا ہے۔ دیکھیے:

آہ، اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ لا تدع مع اللہ الھا آخر (کلیاتِ اقبال اردو، ۵۶۹)

اردو اشعار کی طرح اقبال نے فارسی کلام میں بھی قرآن سے براہِ راست استفادے کا سلسلہ جاری رکھا۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۶۲ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ.

اقبال اس آیتِ ربّانی کے مختلف الفاظ کو یوں استعمال کرتے ہیں کہ ہر جگہ ایک طرف آیات کی تفہیمی سطح بلند ہوتی ہے اور دوسری جانب خود اقبال کے اشعار جگمگا اٹھتے ہیں۔ رموزِ بے خودی کے ایک شعر اور بالِ جبریل کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے:

قوتِ ایماں حیات افزایدت
وردِ لا خوفٌ علیھم بایدت (کلیاتِ اقبال فارسی، ۹۵)

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر شریکِ زمرۂ **لا یحزنون** کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا مَیں مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر (کلیاتِ اقبال اردو، ۴۱۲)

سورۃ آلِ عمران کی آیت ۹۲ (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا) کے دو الفاظ کو اقبال نے اسرارِ خودی کے ایک شعر میں اس خوبی سے باندھا ہے کہ شعر کی قرأت میں دو زبانوں کے صوتی امتیازات کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اقبال

کہتے ہیں:

دل ز حتّی تنفقوا محکم کند
زر فزائید الفتِ زر کم کند (کلیاتِ اقبال اردو،۴۳)

بعض اوقات اقبال کسی مصرع کو ایک آیت سے بھی مزیّن کر دیتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ وہ مصرع بحر و قوافی کے اعتبار سے قطعاً اجنبی دِکھائی نہیں دیتا۔ جاوید نامہ میں 'فلکِ قمر' کے آخری بند کا شعر ملاحظہ فرمائیے اور داد دیجئے کہ ایک فارسی مصرع اور دوسرا عربی اور وہ بھی قرآنی زبان میں، لیکن مجال ہے کہ شاعرانہ حسن یا حسن خیال پر کوئی گرد پڑی ہو:

صرصرے دہ با ہوائے بادیہ
اَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَہ (کلیاتِ اقبال فارسی،۶۴۴)

اقبال کا فن شاعری پر دسترس کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے بعض ظریفانہ اشعار کو مزید پُر اثر بنانے کے لیے بھی مناسب مواقع پر قرآنی آیات سے خوب خوب استفادہ کیا ہے، مثلاً سرمایہ داروں اور اشتراکیوں کے مابین کشمکش کو واضح کرنے کے لیے تین اشعار پر مشتمل ایک قطعہ کے دوسرے شعر میں سورۃ یونس کی آیت ۵۱ اور تیسرے شعر میں سورۃ انبیاء کی آیت ۹۶ کے ایک لفظ کو بھرپور انداز میں استعمال کیا ہے:

محنت و سرمایہ دُنیا میں صف آرا ہو گئے
دیکھیے، ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز
ٹل نہیں سکتا'' و قد کنتم بہٖ تستعجلون''
''کھل گئے'' یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشم مسلم دیکھ لے تفسیرِ حرفِ'' ینسلون'' (کلیاتِ اقبال اردو،۳۲۲)

اقبال کبھی مختلف سورتوں کے نام لے کر ان کے مفاہیم مراد لیتے ہیں، جیسے:

گُل و گُلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں
یہ سبھی سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں (کلیاتِ اقبال اردو، ۸۶)

طلسمِ ظلمتِ شب سورۂ والنور سے توڑا
اندھیرے میں اڑایا تاجِ زر شمعِ شبستاں کا (کلیاتِ اقبال اردو، ۸۸)

اور کبھی مکمل، نامکمل آیات اور کبھی محض آیت کے کسی لفظ کو استعمال کر کے قرآن سے اپنے فکر کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں محض چند آیات یا ان کے الفاظ درج کیے جاتے ہیں: لایخلف المیعاد، (سورہ آلِ عمران:۹) ، لیس للانسان الا ماسعیٰ (سورۃ والنجم:۳۹)، لاتخف (سورۃ طٰہٰ:۶۸)، لاتذر (سورۃ نوح:۲۶)، لاتقنطوا (سورۃ زمر:۵۳)، قل العفو (سورۃ بقرہ:۲۱۹)، یومِ نحسٍ مستمر (سورۃ قمر:۲۶)، اتی الرحمٰن عبداً (سورۃ مریم:۹۳)

اقبال کی شاعری میں قرآن سے استفادے کی دوسری صورت قرآنی مفاہیم کا براہِ راست استعمال ہے۔ اقبال کی شاعری کا اکثر حصہ قرآنی مقاصد کی ترجمانی کرتا ہے، لیکن بعض اشعار مفاہیم قرآن سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں، مثلاً سورۃ فتح کی آخری آیت میں ارشادِ ربانی ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ.

ترجمہ؛ محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی جو ہیں، وہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل

اقبال نے اس آیہ مبارکہ کو مختلف مقامات پر زیرِ نظر رکھا اور چار مقامات پر مختلف انداز میں اس سے اپنے مضمون کو مزین کیا۔ ملاحظہ فرمائیے چاروں اشعار:

نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو ، پاک دل و پاک باز (کلیاتِ اقبال اردو، ۴۲۴)

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن (کلیاتِ اقبال اردو، ۵۵۸)

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو ، وہ شبنم
دریاؤں کے دِل جس سے دہل جائیں ، وہ طوفان (کلیاتِ اقبال اردو، ۵۷۳)

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا (کلیاتِ اقبال اردو، ۳۰۴)

اہلِ علم کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ علاّمہ نے یہاں 'مصافِ زندگی' کی ترکیب استعمال کی ہے۔ لفظ 'مصاف'.....ص ف ف..... کے مادے سے مشتق ہے۔ لفظ 'مَصَاف' جمع ہے اور اس کا واحد 'مَصَفّ' ہے، جس کے معنی ہیں: فوجیوں یا مجاہدین کی وہ جگہ، جہاں ان کی صف بندی کی جائے اور عربی قواعد کے اعتبار سے یہ لفظ اسم ظرفِ مکان ہے۔ مصاف کی اصطلاح صرف وہی شخص استعمال کرسکتا ہے، جسے عربی زبان پر کامل عبور ہو۔ یہ اور اس جیسی بیسیوں مثالیں علامہ کے اُن معترضین کا مسکت جواب ہیں، جو کہتے تھے کہ علامہ عربی زبان پر یدِ طولیٰ نہیں رکھتے۔

ایک اَور شعر دیکھیے، جس میں سورۃ انفال کی آیت ۱۷ (وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى) کے مفہوم کو بیان کیا گیا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز (کلیاتِ اقبال اردو، ۴۲۴)

یا سورۃ رحمٰن کی آیت ۲۶ کے مفہوم..... **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَان**.....کو اس شعر میں ملاحظہ کیجیے:

اوّل و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نَو منزلِ آخر فنا (کلیاتِ اقبال اردو، ۴۲۰)

قرآن سے استفادے کی تیسری صورت قرآنی مفاہیم سے اخذ و اکتساب ہے۔ایسی صورت میں وہ قرآنی آیات کا ہو بہو مفہوم دینے کے بجائے اپنے موضوع سے متعلق واقعے کو چن لیتے ہیں، جس کے ذریعے وہ اپنے خیال کو تقویت دیتے ہیں۔ ذیل میں چھے اشعار پیش کیے جاتے ہیں، جو اگرچہ قرآنی مطالب کے براہِ راست حامل نہیں ہیں، لیکن ان اشعار کی دل کشی میں قرآنی واقعات و قصص کا وافر حصّہ ہے:

سورۃ بقرہ (۳۶:۲) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ۔

ترجمہ: آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انھیں اُس حالت سے نکلوا کر چھوڑا، جس میں وہ تھے۔

اس آیت سے استنباط کرتے ہوئے اقبال نے لکھا:

شجر ہے فرقہ آرائی ، تعصّب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو (کلیاتِ اردو،۱۰۲)

سورۃ یوسف (۲۳:۱۲) میں عزیزِ مصر کی بیوی کے حضرت یوسف کی طرف التفات کا منظر پیش کیا جا رہا ہے:

غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَيْتَ لَكَ۔

ترجمہ: اور ایک دِن دروازے بند کر کے بولی: آ جا۔

اقبال کے ذہن میں یہ آیت اور اس کا مفہوم گردش کرتا رہا، چنانچہ وہ یہ شعر کہنے پر قادر ہو گئے، کیوں کہ مذکورہ آیت سے آگہی کے بغیر درج ذیل شعر نہیں کہا جا سکتا تھا:

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دِکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں (کلیاتِ اقبال اردو،۱۵۸)

سورۃ بنی اسرائیل (۱:۱۷) میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا۔

ترجمہ: پاک ہے وہ، جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے دُور اُس مسجد تک.....۔

واقعہ معراج کے پس منظر میں نازل ہونے والی اس آیت کے مفہوم نے اقبال کے تخلیقی وفور میں ایسا اثر دِکھایا کہ ان کی زبان پر درج ذیل شعر جاری ہو گیا:

رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات (کلیاتِ اقبال اردو، ۲۷۸)

سورۃ انبیا (۲۱: ۶۲-۶۳) میں حضرت ابراہیم کی طرف سے بُت شکنی پر ان کی قوم کا استفسار اور حضرت ابراہیم کا جواب درج ہے:

قَالُوۡۤا ءَاَنۡتَ فَعَلۡتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰۤاِبۡرٰهِیۡمُ. قَالَ بَلۡ فَعَلَهٗ.....۔

ترجمہ: (ابراہیم کے آنے پر) انھوں نے پوچھا: کیوں ابراہیم! تُو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟
اُس نے جواب دیا: بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے۔

اقبال نے اپنے عہد کے اَن گنت تعصّبات اور تہذیبی و وطنی بُتوں کو دیکھا تو قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت کے مفہوم نے ان کی تخلیقی جست کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اقبال پکار اٹھے:

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰـــــہ الا اللّٰـــــہ (کلیاتِ اقبال اردو، ۵۲۷)

سورۃ الصّٰفّٰت (۳۷: ۱۰۲) میں حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل کا ایک تاریخی واقعہ بیان ہوا ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعۡیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ۔

ترجمہ: وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دَوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم نے اس نے کہا: بیٹا! مَیں خواب میں دیکھتا ہوں کہ مَیں تجھے ذبح کر رہا ہوں؛ اب تُو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا: ابا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے، اسے کر ڈالیے؛ آپ اِنشاءاللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔

گہرے قرآنی مطالعے کے نتیجے میں اقبال کے ذہن میں سعادت مند بیٹے کا جواب مدتوں محفوظ رہا ہوگا اور کسی تخلیقی لمحے میں درج ذیل شعر کے قالب میں ڈھل گیا:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی؟ (کلیاتِ اقبال اردو، ۳۵۳)

اور اسی طرح سورۃ بقرہ (۲:۶۰) بنی اسرائیل کی مشکلات کے پیشِ نظر حضرت موسیٰ اور اللہ تبارک وتعالیٰ میں ہونے والا ایک مکالمہ درج کیا ہے:

وَ اِذِ اسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡحَجَرَ ؕ فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡہُ اثۡنَتَا عَشۡرَۃَ عَیۡنًا۔

ترجمہ: اور یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دُعا کی تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو؛ چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

فکرِ سخن کی حالت میں اقبال اپنے بنیادی ماخذ (قرآن) سے کس حد تک وابستہ ہوتے ہیں، اس کا اندازہ مندرجہ بالا آیت اور اقبال کے درج ذیل شعر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر (کلیاتِ اقبال اردو، ۵۰۳)

طوالت کے خوف سے مزید مثالیں سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اگرچہ کلامِ اقبال کا بیشتر حصہ قرآنی پس منظر کا حامل ہے اور اگر ایسے تمام اشعار کی نشان دہی کی جائے تو مضمون کی تنگ دامانی حائل ہوگی، چنانچہ ذیل میں محض چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں، جن میں قرآنی مطالب و مفاہیم سے براہِ اخذ و اکتساب کے بجائے اقبال نے

بالواسطہ استنباط کیا ہے:

اے شمع! انتہائے فریبِ خیال دیکھ
مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ (کلیاتِ اقبال اردو، ۷۷)

کنویں میں تُو نے یوسفؑ کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل! جو مطلق تھا ، مقید کر دیا تُو نے (کلیاتِ اقبال اردو، ۱۰۱)

پروانے کو چراغ ہے ، بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس (کلیاتِ اقبال اردو، ۲۵۳)

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل (کلیاتِ اقبال اردو، ۲۸۶)

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری (کلیاتِ اقبال اردو، ۲۹۰)

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر (کلیاتِ اقبال اردو، ۲۹۵)

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں (کلیاتِ اقبال اردو، ۳۰۲)

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی (کلیاتِ اقبال اردو، ۳۱۰)

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں مَیں
کہ مَیں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ (کلیاتِ اقبال اردو،۳۹۱)

رہے ہیں اَور ہیں فرعون میری گھات میں اَب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا (کلیاتِ اقبال اردو،۳۶۲)

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم!
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر (کلیاتِ اقبال اردو،۳۱۱)

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز (کلیاتِ اقبال اردو،۳۶۳)

ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیِ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں (کلیاتِ اقبال اردو،۳۶۴)

قلندر جُز دو حرفِ لاالٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا (کلیاتِ اقبال اردو،۳۶۸)

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لاالٰہ میں ہے (کلیاتِ اقبال اردو،۳۹۵)

وہ علم اپنے بُتوں کا ہے آپ ابراہیم
کِیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم (کلیاتِ اقبال اردو،۵۳۸)

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گزر اس عہد سے ممکن نہیں بے چوبِ کلیم (کلیاتِ اقبال اردو،۳۸۹)

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد (کلیاتِ اقبال اردو، ۳۹۶)

کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے (کلیاتِ اقبال اردو، ۴۹۷)

خشک سازد ہیبتِ او نیل را
می برد از مصر اسرائیل را (کلیاتِ اقبال فارسی، ۴۵)

یہی ہے سرِ کلیمی ہر اِک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز! (کلیاتِ اقبال اردو، ۵۸۹)

یہ ۱۹۷۹ء کی بات ہے، جب مجھے قاہرہ میں جامعۃ الازہر کے کلیۃ الترجمہ میں دو اڑھائی ماہ قیام کا موقع ملا، جہاں ہر روز مَیں پروفیسر ڈاکٹر مجیب حسین مصری کے پاس حاضر ہوتا، جو حضرت کے بہت بڑے شیدائی اور مداح تھے اور انھوں نے حضرت علامہ کے جملہ اردو اور فارسی دواوین کا منظوم عربی ترجمہ بھی کیا ہے۔ آپ حضرت علّامہ کے بارے میں کہا کرتے تھے: ''*الفیلسوف الاسلامی العلامہ محمد اقبال ھو شاعر القرآن و ان لم یکن کذالك فھو قرآن الشعراء*''۔ مسلمان فلسفی علامہ محمد اقبال قرآن کے شاعر ہیں اور اگر وہ قرآن کے شاعر نہیں ہیں تو وہ شعرا کے قرآن ضرور ہیں۔

حواشی اور حوالے

۱۔ غلام رسول ملک: سرودِ سحر آفریں۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء۔ص ۱۴۳

۲۔ خالد، جاوید اقبال: حافظ برخوردار رانجھا : حیاتی ، فکر تے فن ۔مقالہ برائے ڈگری: پی ایچ ڈی پنجابی۔پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۲۰۰۲ء۔ص ۵۳۳

۳۔ بحوالہ حامد سعید اختر: 'قرآن اور اقبال' مطبوعہ اقبالیات، جنوری-مارچ ۲۰۰۲ء۔ص ۱۹-۲۸

۴۔ غلام رسول ملک: سرودِ سحر آفریں۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء۔ص ۱۴۴

۵۔ ایضاً

۶۔ ڈاکٹر جاوید اقبال: خطباتِ اقبال: تسہیل و تفہیم۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۸ء۔ص ۵-۲۵

۷۔ ایضاً۔ص ۴۷-۴۸

۸۔ مرحوم سید نذیر نیازی نے اپنے ترجمے میں یہ الفاظ لکھے ہیں: محمد عربی بر فلك الافلاك رفت و باز آمد، والله اگر من رفتمے هر گز باز نیامدے ۔دراصل یہ الفاظ ممتاز صوفی ابوسلیمان الدارانی (متوفی: ۲۱۵ھ) کے ہیں، جو اس طرح ہیں: **لو و صلوا ما رجعوا** ۔ خود سید نذیر نیازی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ انھیں حضرت گنگوہی کے اصل الفاظ نہیں ملے ۔انھوں نے انگریزی الفاظ کا فارسی میں محض ترجمہ کیا ہے۔ جب کہ اعجاز الحق نے محولہ بالا اصل الفاظ بھی درج کر دیے ہیں، جن کا حضرت گنگوہی نے ابوسلیمان الدارانی کے محولہ بالا عربی الفاظ سے اکتساب کیا۔(وحید عشرت: تجدید فکریاتِ اسلام۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء دوم)

۹۔ Iqbal, Muhammad: *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Ed by M Saeed Shaikh, p-99

۱۰۔ بحوالہ الطاف احمد اعظمی: خطباتِ اقبال: ایك مطالعه۔لاہور: دار التذکیر، ۲۰۰۵ء۔ص ۱۸۱

۱۱۔ الطاف احمد اعظمی۔محولہ بالا۔ص ۱۸۱-۱۸۲

۱۲۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی: 'حیاتِ اقبال کا سبق: سید ابوالاعلیٰ'۔مطبوعہ ہفت روزہ ایشیا، لاہور، ۱۵/نومبر تا ۲۱/نومبر ۲۰۱۲ء۔ص ۲۲

۱۳۔ پروفیسر محمد منوّر: 'مقامِ قرآن، علامہ اقبال کی نظر میں'۔مشمولہ محور، ۱۹۷۲ء-۱۹۷۳ء۔ص ۳۰

۱۴۔ مظفر حسین: اساسِ فکرِ اقبال۔لاہور: آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس، س ن۔ص ۶۲-۶۳، ۶۸

۱۵۔ بحوالہ غلام رسول ملک: سرودِ سحر آفریں۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۷ء۔ص ۱۴۴

۱۶۔ فقیر سید وحید الدین: روزگارِ فقیر۔لاہور، ۱۹۶۶ء۔ص ۲۱-۲۲

❑❑❑